خورشید احمد ندیم

سوٗر کی حرمت اور مذہبی روشن خیالی

انسانی جسم میں سوٗر کے دل کی پیوند کاری پر، جاوید احمد صاحب غامدی بڑی حد تک وہی بات کہتے دکھائی دیے جو روایتی علما کا موقف ہے۔ جاوید صاحب کی تعریف میں رطب اللسان، بہت سے روشن خیالوں کو اس پر حیرت ہوئی۔ ان کا تبصرہ تھا کہ اندر سے یہ بھی مولوی نکلے۔

مذہبی روشن خیالی، کیا اس کا نام ہے کہ ہر نئے خیال یا امکان کے لیے مذہبی متون سے دلیل تلاش کی جائے؟ بہت سے لوگ ان علما اور اسکالرز ہی کو روشن خیال مانتے ہیں جو ہر نئی بات کو مذہبی دلیل فراہم کریں۔ اگر کسی معاملے میں، وہ جدت پسندوں سے اختلاف کر بیٹھیں تو وہ بہ یک جنبش قلم ان سے اپنا عطا کردہ روشن خیالی کا اعزاز واپس لے لیتے ہیں۔ کچھ یہی معاملہ جاوید صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔

جاوید صاحب کے بارے میں میرا یہ احساس دن بہ دن پختہ ہوا ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ان کو سمجھنے میں غلطی کی۔ یہ لوگ ہر طرح کے طبقات میں پائے جاتے ہیں۔ اہل مذہب میں زیادہ، لبرل طبقے میں کم۔ اس غلطی کا بڑا سبب لاعلمی ہے۔ اکثر ناقدین نے انھیں سمجھنے کی وہ سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی جو تنقید کا بنیادی مطالبہ ہے۔ ان کے مذہبی ناقدین کی تحریریں پڑھیں یا ان کو سنیں تو یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت نے ان کی کوئی ایک کتاب اہتمام کے ساتھ نہیں پڑھی۔ لبرل لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جاوید صاحب کی اساسی فکر ہی سے بے خبر رہے۔ وہ ان معنوں میں کبھی جدت پسند تھے ہی نہیں جو معنی ان کے ہاں رائج ہیں۔

میرے پیش نظر یہ سوال نہیں کہ سوٗر کے اعضا کی پیوند کاری کے باب میں ان کا موقف درست ہے یا غلط؟ میں مذہب اور روشن خیالی کے فرق پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میری یہ تفہیم بڑی حد تک جاوید صاحب کے تلمذ ہی

کا نتیجہ ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تفہیم کی تمام تر ذمہ داری طالب علم پر ہے، استاذ پر نہیں۔

مذہب اپنی اساس میں ایک مابعد الطبیعیاتی عمل ہے اور قدیم ہے۔ انسان کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت معلوم تاریخ میں یکساں رہی ہے۔ اللہ کے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ وہ کوئی نیا دین لے کر آئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول اور قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ملت ابراہیمی کے احیا کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ قرآن مجید کا کہنا ہے کہ حضرت آدم سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیا کا دین ایک ہی ہے۔

اس لیے مذہب اساسی معنوں میں کبھی جدید نہیں ہوتا۔ جو آدمی مذہبی علم سے وابستہ ہو، اس کا وظیفہ یہ نہیں ہے کہ وہ مذہب کو اپنے عہد کے فیشن کے مطابق چولے پہناتا رہے، اس کا کام یہ دیکھنا ہے کہ مذہب کبھی اپنی اساسات سے الگ نہ ہو۔ کوئی نیا خیال یا نظریہ، مذہب کو یرغمال نہ بنائے اور اگر ایسا ہو تو وہ اسلام کو اس کی اساسات پر کھڑا کرنے کی کوشش کرے۔ تجدید دین اسی کا نام ہے۔

یہ مذہب کا نہیں، انسان کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے حدود میں سوچنے پر مجبور ہے۔ انسانوں کی اکثریت اپنے عہد کے علمی مزاج کی اسیر ہوتی ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ چاہتی ہے کہ اس کا مذہب اس عہد کے علمی معیارات پر پورا اترے۔ یہ کوئی نامسعود خواہش نہیں، لیکن اس باب میں انسانوں کی خود رفتگی اکثر ان کو اس مقام پر لے جاتی ہے کہ وہ نادانستگی میں مذہب کو عصری علم کا مقتدی بنا دیتے ہیں۔

مذہب کا مقدمہ یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور فطرت اس کی نظر میں ناقابل تبدیل ہے۔ اس فطرت میں ایک خالق اور پروردگار کا شعور رکھ دیا گیا ہے۔ یہ شعور اس خالق کے ساتھ تعلق کا مطالبہ کرتا ہے جو ایک قادر مطلق ہستی اور منعم حقیقی ہے۔ مذہب اس تعلق کی صورت گری کرتا ہے۔ وہ انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک امتحان گاہ میں کھڑا ہے۔ امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر جیتا ہے یا اس کا انکار کرتا ہے؟ اسی کی بنیاد پر اس کی دائمی زندگی کا فیصلہ ہونا ہے۔ باقی سب اسی کی تفصیلات ہیں۔

تمدن، سیاست اور تہذیب، ان میں سے کوئی مذہب کا اصل موضوع نہیں؛ تاہم یہ فطری بات ہے کہ اللہ کا بندگی کے احساس میں جینے والا کوئی گروہ کسی سیاست یا تہذیب کو جنم دے گا تو خدا کے ہاں جواب دہی کا احساس اس کی بنیاد ہو گی۔ گویا یہ موضوعات، اگر مذہبی علم کا حصہ بنتے ہیں تو بالواسطہ۔ مثال کے طور پر تزکیۂ نفس کو مذہب مطلوب قرار دیتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ قیامت کے دن وہی کامیاب ہوں گے جنھوں نے اپنا تزکیہ کیا۔ یہ تزکیہ یا پاکیزگی داخلی بھی ہے اور جسمانی بھی۔ یہ پاکیزگی جن امور کو لازم قرار دیتی ہے، اسے شریعت کہا جاتا ہے

جو پیغمبروں کی معرفت ملتی ہے۔ یہ پاکیزہ لوگ جو رہن سہن اختیار کریں گے، وہ ان لوگوں کے رہن سہن سے مختلف ہو گا جو پاکیزگی کے اس احساس سے بے نیاز ہیں۔ یوں اس کا نتیجہ ایک تہذیبی امتیاز کی صورت میں نکلے گا۔

اسی طرح خدا کے ہاں جواب دہی کا احساس رکھنے والا جب سیاست کرے گا تو اس کی سیاست اس شخص سے مختلف ہو گی جو اس احساس سے عاری ہے۔ یہ کچھ بدیہی نتائج ہیں جو کسی تصور حیات کے تابع ہوتے ہیں۔ اسی سے تہذیبی اور سماجی رویے جنم لیتے ہیں۔ تمدن یا سیاست، فی نفسہٖ مذہبی اعمال نہیں ہیں۔ ان کا تعلق انسان کے جمالیات یا ضروریات سے ہے۔ ان ضروریات کی تکمیل ایک ارتقائی عمل ہے۔

جدیدیت انسانی تاریخ کا ایک ایسا دور ہے جب ان ضروریات کی تکمیل کے لیے انسان کا تمام تر انحصار اس کی عقل پر رہا۔ اس نے کسی دوسرے ماخذ عمل سے شعوری طور پر اکتساب سے انکار کیا۔ اس سے جو تہذیب وجود میں آئی، اس نے اپنے غلبے کو اپنے حق ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا، جسے مرعوب ذہنوں نے قبول کر لیا۔ اگر وہ مذہبی پس منظر رکھتے تھے تو انھوں نے چاہا کہ مذہب کا مقدمہ، جدیدیت کے معیارات پر پورا اترے اور یوں مذہب بھی جدید دکھائی دے۔

جاوید احمد صاحب غامدی کا اس سوچ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں پورے اطمینان سے یہ عرض کرتا ہوں کہ مذہبی امور میں ان کی کوئی ایک رائے ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد دینی نصوص نہ ہو۔ دینی نصوص کی تفہیم میں وہ جو اسلوب اختیار کرتے ہیں، اس کا تعلق بھی متن کے داخل سے ہے، خارج سے نہیں۔ مثال کے طور پر اگر وہ مرد و زن کے اختلاط کے باب میں مذہب کا مقدمہ پیش کرتے ہیں تو اس کی بنیاد دور جدید کے مطالبات نہیں ہیں جنھوں نے عورت کو مرد کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا ہے، بلکہ قرآن مجید کے نصوص میں ہے۔

اب چونکہ لوگ ان کے نظام فکر کو نہیں جانتے، اس لیے ان کے بعض نتائج فکر سے، انھیں ان معنوں میں ایک جدید اسکالر سمجھتے ہیں، جس کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ ہر نئی بات کو دین سے ثابت کرے، چنانچہ انھیں حیرت ہوتی ہے کہ وہ سوئر کے اعضا کی پیوندکاری کے حق میں کیوں نہیں ہیں۔ اگر تنقید کے باب میں بنیادی شرط پوری کر دی جائے تو پھر شاید ان لوگوں کو حیرت نہ ہو۔ اس کے بعد یہ ان کا فیصلہ ہے کہ وہ انھیں روشن خیال مانتے ہیں یا نہیں۔

(بشکریہ: روزنامہ دنیا)